انور سجاد: ایک منفرد اسلوب کا باغی ادیب

عبداللہ صوفی
ریسرچ اسکالر (شعبۂ اردو)
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی
Email:abdullahsufi25@gmail.com
Mob:9358086312

ملخص

انور سجاد کا نام اور ان کا ادبی رجحان کسی تعارف کا محتاج نہیں جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے عرصے دراز تک ناقدین کی گفتگو کا موضوع بنے رہے۔ جب تک وہ ادبی تحریریں لکھتے رہے ناقدین کو ان کی تحریروں میں باغیانہ عنصر ہی دکھائی دیا۔ ترقی پسند تحریک کے برخلاف (کہ اس میں ادیب اور قاری کا براہِ راست ربط ہوتا ہے) انور سجاد کی تحریریں سنجیدہ اور عالمانہ صلاحیت رکھنے والے قارئین تک کی فہم وادراک میں آنے سے قاصر تھیں چہ جائے کہ انھیں عام قاری سمجھ پاتا۔ مستقبل کی پرواہ کیے بغیر انور سجاد نے حال کے حالات کو ذاتی تجربوں کی بنا پر پیش کیا۔ یہ تجربہ بالکل ذاتی تھا جس میں میرؔ کی آپ بیتی اور جگ بیتی والی تاثیر قطعی نہیں تھی لیکن ان کا مشاہدہ اور تجربہ برحق اور سچا تھا۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کے ظلم وستم کے خلاف احتجاج تھا۔ ایسا معاشرہ جہاں حق بات کہنے والا شخص مجرم سمجھا جاتا، جہاں صحافت کمزور پڑ گئی تو لوگوں نے ادب کا سہارا لیا۔ انور سجاد بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں۔

انور سجاد: ایک منفرد اسلوب کا باغی ادیب

انور سجاد کے والد سید دلاور علی شاہ لدھیانہ کے باشندے تھے اور ان کی والدہ امرتسر کی تھیں۔ انور سجاد اپنے تین بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں اور ان کی اسی قدر بہنیں بھی ہیں جس میں ایک ان سے بڑی ہیں۔ان کے والد شہر کے مشہور فزیشین تھے لہٰذا انور سجاد کے مطابق والد صاحب کو اپنا کوئی نہ کوئی ولی عہد چاہیے تھا۔انہوں نے جان بچانے کی بہت کوشش کی ان کا خیال سول سروس یا اسپورٹ میں جانے کا تھا مگر والد صاحب کی وجہ سے مجبوراً ڈاکٹر بن گئے۔

انور سجاد نے سینٹ پال اسکول (لاہور) سے میٹرک کیا پھر گورنمنٹ کالج سے ایف۔ ایس۔سی اور ایف۔سی کالج لاہور سے گریجویشن مکمل کیا۔بچپن سے ہی انور سجاد کی طبیعت ادب کی طرف مائل تھی۔چھٹی کلاس سے ہی ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں جانے لگے تھے۔لاہور میں انٹر اسکول اور انٹر کالج مقابلوں میں ڈرامے پیش کرتے تھے جس کی کافی پزیرائی ہوتی تھی۔گورنمنٹ کالج میں پاور فل ڈرامیٹک سوسائٹی تھی جس کے زیر اثر ڈرامے پیش کرتے تھے پھر جب میڈکل کالج گئے تو وہاں بھی ویسا ہی ماحول مل گیا۔میڈکل کالج میں ڈاکٹر اعجاز کے توسط سے تھیٹر پر کام شروع کر دیا۔

انور سجاد کی ساخت و پرداخت میں سینٹ پال اسکول کا بڑا ہاتھ رہا۔انور سجاد وہاں کی سالانہ میگزین میں مسلسل لکھتے رہے۔اور خوش نویسی بھی خود ہی کرتے تھے۔مشفق اساتذہ کے زیر اثر شخصیت پروان چڑھنے لگی۔وہیں سے 'پھول' اخبار کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا جس کو امتیاز علی تاج کے والد تاج علی نکالتے تھے۔پھر اسکول کی لائبریری سے جنوں اور پریوں کی کہانیوں کی کتاب نکالتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے۔اس طرح سے ان کی شخصیت میں اسراریت داخل ہو رہی تھی۔اس کے علاوہ گرمیوں میں جب وہ تاروں بھرے آسمان کے نیچے سوتے تو یہ منظر ان کے لیے تحیر اور تجسس کا سامان پیدا کرتا۔ تاروں بھرے آسمان میں چاند کی مدھم رفتار کے ساتھ ان کا خیال انہیں قدیم انسانوں کی دنیا میں لے جاتا جہاں سے ان پر آواز، اشارہ اور رنگوں کی اہمیت کا انکشاف ہوا۔اور یہیں سے ان کی شخصیت کو موسیقی،

رقص اور رانگوں کے عناصر نے مل کر پروان چڑھانا شروع کیا۔ انور سجاد یہ سمجھتے ہیں کہ تمام فنون ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح مربوط ہیں۔ ان کے مطابق اگر کسی نے خود کو ایک فن میں محدود کر لیا اور دوسرے فنون کو نظر انداز کر دیا تو اس کا تناظر انتہائی محدود ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں جا بجا مصوری کا رنگ اور موسیقی کا آہنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

انور سجاد کے مطابق انہیں ہر قدم پر حوصلہ افزائی کرنے والے اور صلاحیت کو نکھارنے والے اساتذہ ملے جن کی بدولت وہ ساٹھ کی دہائی تک اچھے ڈرامے لکھنے لگے تھے اور بعض میں تو وہ خود بھی اداکاری کرتے۔ ان کے اس وقت کے ساتھیوں میں شعیب ہاشمی، نعیم طاہر، خالد سعید بٹ، فاروق سلیم، ضیاء محی الدین کی شخصیت قابل ذکر ہیں۔

1950 سے 1970 تک کا زمانہ انور سجاد کے لیے بڑا زرخیز تخلیقی دور تھا۔ وہ ہمہ اقسام کی تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ تھیٹر ہو رہا تھا۔ فکشن لکھا جا رہا تھا۔ بغاوتیں ہو رہی تھی۔ صرف پاکستان ہی کے نہیں بلکہ اس عہد میں انور سجاد دنیا بھر کے حالات سے آگاہ رہتے اور اس سے متاثر بھی ہوتے جس کا اثر ان کی تخلیقی سرگرمیوں پر پڑ رہا تھا۔ 1950 میں ہی انور سجاد نے مصوری کا آغاز بھی کیا۔ ''آرٹس کونسل آف پاکستان'' کے ذریعہ ان کی ملاقات 'قطب بی شیخ اور معین نجمی' سے ہوئی۔ ان دونوں اشخاص نے جو فن مصوری کا خاصہ علم رکھتے تھے انور سجاد کی ہر قدم پر راہنمائی کی۔

1949 میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کی۔ اس زمانے کی ایک تنظیم (Democratic Students Federation) سے منسلک ہوئے جس کے سیکریٹری 'منصور ملک' کے توسط سے مزدور یونین سے متعارف ہوئے۔ اس طرح سے ان کے اندر اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کا شعور بیدار ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہی میں انور سجاد نے منٹو کی موجودگی میں کہانی پڑھ کر سنائی جسے منٹو نے کافی پسند کیا۔ اس کا ذکر انور سجاد اس طرح کرتے ہیں کہ:

> ''جب کہانی میں پہلی تشبیہ آئی تو انہوں نے کہا ''واہ'' دوسری بار پھر کوئی اچھا موڑ یا کوئی اچھی تشبیہ آ گئی تو منٹو صاحب نے پھر کہا ''بھئی واہ'' اس کے بعد یہ ہوا کہ وہاں بیٹھے سب لوگ ہی منٹو صاحب کی ''واہ'' سے پہلے ''واہ'' کرنے لگے''۔
>
> انٹرویو بی۔ بی۔ سی (اردو)

دراصل 1950 میں ان کی ملاقات 'سعادت حسن منٹو' سے ہوئی اور 1950 سے 1955 تک برابر منٹو کا ساتھ رہا۔ وہ منٹو کی بہت عزت کرتے اور کہتے کہ منٹو سب سے بڑے آدمی تھے جن سے میں کبھی ملا ہوں۔ ادیبوں کی صحبت میں رہ کر ان کے اندر ادب فہمی کی صفت پروان چڑھ رہی تھی۔ لہٰذا 1952 میں ان کی پہلی کہانی ''ہوا کے دوش پر'' کے نام سے ''نقوش'' میں شائع ہوئی۔ اس کے تین سال بعد ہی انکا مختصر ناول ''رگِ سنگ'' منظرِ عام پر آیا جس کا دیباچہ ڈاکٹر 'عبارت بریلوی' نے لکھا تھا۔ اس میں عبارت بریلوی نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ انور سجاد آگے چل کے اور اچھا لکھ سکیں گے۔

ان کا پہلا باقاعدہ کھیلا جانے والا ڈرامہ انگریزی کا تھا۔ اور اسی میں انہوں نے پہلی بار اداکاری کی۔ ڈرامے کا نام ''لائبل'' تھا۔ ڈاکٹر صادق جو اس وقت ڈرامیٹک کلب کے انچارج تھے یہ ڈرامہ انہیں کی نگرانی میں 1964 کھیلا گیا تھا جس میں انور سجاد کا سائیلنٹ silent رول تھا۔ اس وقت وہ بہت اداس ہوئے اور انہوں نے وہ رول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر ڈاکٹر صادق نے انہیں سمجھایا کہ رول چھوٹے بڑے نہیں ہوتے ایکٹر ہوتے ہیں۔ تب جا کر انور سجاد اس میں کام کرنے پر راضی ہوئے مگر وہ اس رول میں پریشان ہو گئے اور تعجب کرنے لگے کہ ایکٹر اتنے سارے لوگوں کے سامنے آخر کیسے اداکاری کر لیتے ہیں۔ اپنی اسی جھجھک کا ذکر کرتے ہوے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اسکول میں ایک بار انہوں نے Debate میں حصہ لیا تقریر خوب اچھی طرح یاد کی 5 منٹ کا وقت ملا تھا اور 2 منٹ بعد ہی سب کچھ بھول گئے۔ ان کو خدشہ ہوا کہ جو نیکر وہ پہنے ہوے ہیں وہ ڈھیلی ہو کر گر نہ جائے۔ بہر حال انور سجاد نے اپنی اس جھجھک پر خصوصی توجہ دی اور ڈرامے میں ایک کامیاب اداکار کے طور پر خود کو ثابت کیا۔

انور سجاد کے اس ڈرامے میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم معین الدین احمد قریشی نے بھی کام کیا تھا۔ معین الدین احمد قریشی 18 جولائی 1993 سے 19 اکتوبر 1993 (تین ماہ ایک دن) تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے ہیں۔

انور سجاد مسلسل ادبی حلقوں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے ادب کے نئے طالب علموں کی سرپرستی کی۔ ضرورت پڑنے پر مشکل سے مشکل لمحات میں حوصلہ مند نظر آئے۔ انھیں ناقدین کی سخت تنقیدیں بھی سننی پڑیں مگر وہ زندگی کے ہر موڑ پر ثابت قدم رہے۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکوہ۔ ادب کو اعلیٰ مدارج سے گزارتے ہوئے بلندی پر پہچانے کے لیے کوشاں ڈاکٹر انور سجاد کو 1989 میں حکومت پاکستان کی

طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی (Pride of Performence) کے اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز پاکستان میں ادب، فنون، کھیل، طب، سائنس اور دیگر شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے والوں کو یوم پاکستان (23، مارچ) کے موقع پر صدرِ جمہوریہ کے ہاتھوں دیا جاتا ہے۔

انور سجاد کا نام اور ان کا ادبی رجحان کسی تعارف کا محتاج نہیں جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے عرصے دراز تک ناقدین کی گفتگو کا موضوع بنے رہے۔ جب تک وہ ادبی تحریریں لکھتے رہے ناقدین کو ان کی تحریروں میں باغیانہ عنصر ہی دکھائی دیا۔ ترقی پسند تحریک کے برخلاف (کہ اس میں ادیب اور قاری کا براہِ راست ربط ہوتا ہے) انور سجاد کی تحریریں سنجیدہ اور عالمانہ صلاحیت رکھنے والے قارئین تک کی فہم وادراک میں آنے سے قاصر تھیں چہ جائے کہ انھیں عام قاری سمجھ پاتا۔ مستقبل کی پرواہ کیے بغیر انور سجاد نے حال کے حالات کو ذاتی تجربوں کی بنا پر پیش کیا۔ یہ تجربہ بالکل ذاتی تھا جس میں میرؔ کی آپ بیتی اور جگ بیتی والی تاثیر قطعی نہیں تھی لیکن ان کا مشاہدہ اور تجربہ برحق اور سچا تھا۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کے ظلم وستم کے خلاف احتجاج تھا۔ ایسا معاشرہ جہاں حق بات کہنے والا شخص مجرم سمجھا جاتا، جہاں صحافت کمزور پڑ گئی تو لوگوں نے ادب کا سہارا لیا۔ انور سجاد بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ انھوں نے پاکستان بننے کا خواب دیکھا، آزادی کے بعد فسادات دیکھے، سیاست اور مذہب کے نام پر ظلم واستبداد کا دور دیکھا اور اسے ایک دردمند انسان کی طرح محسوس کیا۔ اس لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں معاشرے کے ظلم کے خلاف احتجاج کیا اور علامتی اور تجریدی اسلوب اختیار کیا جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں شعریت سما گئی اور بعض دفعہ اتنی سما گئی کی قارئین کے لیے انھیں سمجھنا دشوار ہو گیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی جو جدید افسانوں کی حمایت کرنے میں پیش پیش ہیں اور جنھوں نے انور سجاد کو نئے افسانوں کا ''معمارِ اعظم'' کہا ہے ان کے نزدیک بھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شعریت افسانے کو ناکام بناتی ہے۔ بعض جگہ انور سجاد بھی افسانے میں شعریت کا استعمال اتنا زیادہ کر گئے کہ اس پر غیر افسانویت کا الزام لگنے لگا۔ افسانے کا بنیادی عنصر کہانی پن ہے اور کہانی پن سے مراد یہ ہے کہ افسانہ پڑھنے والا قاری جب افسانہ ختم کر چکے تو اپنی سمجھ کے مطابق واقعات کو ترتیب دے کر اس کو کہانی بیان کر سکے۔ انور سجاد کے بہت سے افسانے اسی نوعیت کے ہیں اور اسی زمرے میں آتے ہیں جن میں کہانی پن

بھی ہے اور شعریت جیسی معنی کی تہہ داری بھی۔ ناول 'خوشیوں کا باغ' ایسی ہی تحریر کی بہترین مثال ہے۔ وہیں دوسری طرف انور سجاد کی لکھی ہوئی بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں کردار اپنی پوری داخلی کیفیات کے ساتھ جلوہ گر تو ہوتے ہیں لیکن ان میں افسانویت نہیں ملتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انور سجاد کرداروں کی نفسیات اور ان کے جذبات بیان کرنے میں پوری مہارت رکھتے ہیں بھلے ہی وہ کردار بے نام اور گمنام ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کرداروں سے ہم کو ویسی ہی محبت اور ہمدردی ہوتی ہے جیسے حقیقی انسانوں سے۔ ایسے کرداروں کے استعمال کے باوجود انور سجاد کے بعض افسانوں میں کہانی پن کا فقدان ہے چہ جائیکہ ان کے کردار متاثر کن اور فعال نظر آتے ہیں۔ ان کے پانچ افسانے جسے انھوں نے ترتیب دے کر 'آج' کے نام سے شائع کیا اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ پروفیسر فاروقی اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

> '' پانچوں تحریروں میں قوت تخلیق و تعمیر کے لیے عورت بطور ماں کا روپ استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور انور سجاد کا پسندیدہ پیکر، یعنی نوجوان لڑکی جو زندگی کی پرورش کرتی ہے، پھر اسے جنم دیتی ہے اور پھر اس کی پرورش کرتی ہے، اپنی تمام رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کے اوپر استحصال اور ستم کی قوتیں یلغار کرتی ہیں لیکن وہ primeval chaos کی طرح زندگی سے بھرپور ہے۔ وہ زندگی جو بغاوت کرتی ہے، جو کبھی پوری طرح شکست یاب نہیں ہوتی۔ حیاتیات اور جینیات (genetics) سے مستعار لیے ہوئے پیکروں اور الفاظ کے ذریعہ لڑکی، ماں، زندگی، تخلیق تولید، chaos اور تولید نو کی حیثیت تو مستحکم ہوتی ہے لیکن افسانہ نہیں بنتا۔ افسانے کی جگہ ایک سمندری، ابلتی ہوئی گرم اور پیچیدہ شعری ہیئت خلق ہوتی ہے۔ یہی انور سجاد کی ناکامی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2006، صفحہ نمبر 106-107

انور سجاد کے متعلق ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فزیشین، مصور اور اداکار بھی ہیں انکی اس ہمہ جہت شخصیت نے ان کے ادب کو بھی کثیر الجہات بنا دیا۔ انور سجاد کی تحریروں میں ہم کو جا بجا میڈکل سائنس اور مصوری کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ زمین، ستاروں اور سیاروں کی

گردش کو رقص سے تعبیر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی فطرت کا باغیانہ خمیر انھیں نت نئے تجربے کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اس خوف سے بے پرواہ کہ ان کا یہ تجربہ قبول ہوگا یا نہیں۔ان کی تحریروں میں جہاں ایک طرف باغیانہ عنصر نظر آتا ہے وہیں دوسری طرف وہ اسلوب اور تکنیک کے میدان میں فن مصوری کے زیر اثر تجربہ کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کے اس تجربے سے اگر انھیں فائدہ ہوا تو بعض جگہ انھیں ناکامی بھی ہوئی اور غالباً فاروقی جس ناکامی کی بات کر رہے ہیں وہ یہی ان کا خود کو منفرد انداز میں پیش کرنے کا تجربہ ہے۔علی حیدر ملک ان کے افسانوی مجموعے 'استعارے' کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہر تحریک یا رجحان کے ساتھ کچھ بدعتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کہ علامتی افسانہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔اس کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے بعض لکھنے والے علامتوں میں معنویت پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔انھوں نے علامتیں تو پیش کر دیں لیکن علامتوں کے درمیان سے افسانہ کہیں غائب ہو گیا۔'استعارے' میں شامل انور سجاد کی کئی کہانیاں اس کی واضح مثال ہیں لیکن انور سجاد کی یہ مجبوری قابل فہم ہے کہ وہ مصور بھی ہیں اور مصوری کے بعض اسالیب کو افسانے میں برتنے میں جہاں وہ کامیاب ہوئے ہیں وہاں بعض جگہوں پر انھیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ان کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کہانیاں تجربے کی نذر ہو گئیں۔''

علی حیدر ملک، علامتی افسانہ کمزوریاں اور جعلسازیاں، مشمولہ افسانہ اور علامتی افسانہ، جے۔آر۔آفسیٹ پرنٹر، نئی دہلی، 1999

انور سجاد کے یہاں اپنے کلچر سے گہرا لگاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی تحریروں میں جا بجا اپنی کلاسیکی اقدار کے تلف ہو جانے کا رنج ہے۔ان کے نزدیک تہذیب سے ہی انسان اور اس کے معاشرے کی پہچان ممکن ہوتی ہے۔انسان کا ترقی کے زعم میں اپنی تہذیب سے دور ہو جانے کا المیہ بھی ان کی تحریر میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے اس بابت اظہار کیا کہ آج لوگوں نے اپنے کلچر کو بھلا دیا ہے۔انو سجاد تعلیم کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس عمل کو ایک مسلسل عمل سمجھتے ہیں۔تعلیم

کے ذریعہ ہی تہذیب کا جنم ہوتا ہے۔انور سجاد کی تحریروں میں تہذیبی اقدار کی پامالی کا المیہ صاف دیکھنے کو مل جائے گا۔تہذیب کے حوالے سے ہی کسی معاشرے کی شناخت قائم ہوسکتی ہے اور تہذیب تعلیم سے ہی آتی ہے لہٰذا اگر تعلیم صحیح ہوگی تو معاشرہ صحت مند رہے گا۔اس طرح سے معاشرے میں پھیل رہی برائیوں کی ایک بڑی وجہ تعلیم کا فقدان بھی ہے کہ آج تعلیم اس پایے کی نہیں ہے جو انسان کے اندر انسانیت کو فروغ دے کر اسے ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کرنے والا فرد بنا سکے۔

انور سجاد ایک ذہین، حساس اور بے باک شخص کا نام ہے جس نے اپنی قوم کی پست ہوتی صورتِ حال کو نظر انداز کرنا گوارا نہیں کیا انھوں نے اپنی تحریروں میں معاشرے کے اسی جبر کے خلاف احتجاج کا علم بلند کیا ہے جو ترقی اور مذہب کا سہارا لے کر قوم کو گمراہ کر رہا ہے۔انور سجاد کی تحریروں میں جگہ جگہ سرمایا دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ردِعمل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے مطابق انھیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ اس تعلق سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہاں تک کہ حکومت کا نظریہ ان کے تعلق سے بالکل واضح ہوگیا ہے کہ جب بھی حکومت کی جانب سے ان طبقوں کو مزید تقویت دینے کی کوشش کی جائے گی انور سجاد مخالف کرنے والوں میں پیش پیش ہوں گے۔موضوعی اعتبار سے ان کی یہ فکر انھیں ترقی پسندوں سے قریب لے جاتی ہے۔وہیں دوسری طرف اسلوب اور طرزِ تحریر کے حوالے سے وہ اس کے مخالفین کی صف میں نظر آتے ہیں۔ان کا یہ بیان کہ ''ہماری گرومنگ، شکل وصورت تو ترقی پسندوں نے بنائی لیکن ہماری لڑائی بھی ان کے ساتھ رہتی تھی''، ہمیں بتاتا ہے کہ انھوں نے کبھی خود کو کسی ادبی تحریک سے منسلک کرنا نہیں چاہا۔یہاں تک کہ نئے افسانے کے جس اسلوب کے وہ موجد سمجھے جاتے ہیں انھیں اس کی بھی کوئی خواہش نہیں۔ان کے نزدیک یکسوئی اور دلجمعی سے تخلیقی سرگرمی میں مصروف رہنا ہی عمل مستحسن ہے۔اپنے ٹیلی ڈراموں کے مجموعے ''تلاش وجود'' میں ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے لکھے ہوئے دیباچے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ:

> ''مجھے خود کو کسی ادبی تحریک یا اسلوب کا بانی مبانی، موجد یا راہبر ثابت کرنے کا بھی شوق نہیں کہ اس سلسلے میں مختلف ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے مہم چلاؤں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ان مہموں کے صلے میں خود اپنے آپ کو دیے ہوئے اعزازات اور تمغے ان ہی کو مبارک ہوں جن کا سینہ تنگ اور پشت کشادہ

ہے۔ مجھے فنون میں (خاص طور پر فکشن میں کہ اس میدان میں حملہ وروں کی یلغار زیادہ ہے) اپنی ثانوی حیثیت تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ باقی سب خود کو صفِ اول بلکہ اول نمبر کا فنکار ثابت کرتے کرواتے رہتے ہیں۔ کوئی تو صفِ دوم یا دوسرے نمبر کا فنکار بھی ہونا چاہیے تا کہ اولیت کا وجود ثابت ہو سکے۔ اور فن کاروں (خاص طور پر افسانہ نگاروں) کا یہ کرائسس تو ختم ہو اور وہ دلجمعی، یکسوئی سے اپنے تخلیقی کام کی طرف توجہ دے سکیں اور شاید بات بن جائے۔''

انور سجاد، تلاش وجود، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1986 صفحہ نمبر 11-10

انور سجاد کے مطابق تخلیقی عمل بڑا مشکل کام ہے۔ اس کے لیے انسان کو واردات، تجربہ، مشاہدہ، مطالعہ اور ادراک سے گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی پوری دسترس ہونی چاہیے۔ یہ اشارہ دراصل ان فرضی لکھنے والوں کی طرف ہے جنھوں نے جدیدیت اور تجریدیت کے نام پر ایسی ایسی ناکارہ کہانیاں لکھیں جن پر ناقدین نے سخت رائے کا اظہار کیا، جن رایوں کی گرفت میں خود انور سجاد کی تحریریں بھی آنے لگیں۔ جس کے سزاوار جہاں ایک طرف فرضی اور جعلی لکھنے والے ہیں وہیں دوسری طرف وہ ناقدین بھی ہیں جنھوں نے اپنی تنگ نظری کی بنا پر اس طرح کی لکھی ہوئی تمام تحریروں کو رد کرنے کی کوشش کی۔ انور سجاد خود کو ایک عام انسان سمجھتے ہیں جو محنت اور ریاضت کر کے تخلیق کرتا ہے۔ اس لیے ناقدین کا ان کی تحریروں کو رد یا قبول کرنے سے پہلے انھیں بشری تقاضوں پر جانچنا ضروری ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں کہانی لکھتا ہوں اور اس کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ غیب سے مضامین میرے خیال میں نہیں آتے کہ غیب اور میرے درمیان انسان موجود ہے۔ میں غیب کو انسانیا سکتا ہوں، لیکن انسان کو غیبیا نہیں سکتا۔ میں الہام کی ریخ میں نہیں آتا۔ میں اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں، خوبیوں، توانائیوں اور فراخ دلی، کمینگی کے باوصف ایک عام انسان ہوں۔ شکر ہے کہ خود کو بے عیب نہیں سمجھتا۔ ورنہ اپنے پہلے ناتواں مجموعے ہی کو الہامی کتاب منوانے کی کوشش میں خفقان کا شکار ہوتا۔''

انور سجاد، تلاش وجود، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 1986 صفحہ نمبر 9

انور سجاد کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے ان کو محض جدیدیت کا نمائندہ ادیب تصور کرنا صحیح نہ ہوگا۔ انھوں نے ترقی پسندوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ منٹو اور وقار عظیم کی صحبت سے فیض یابی بھی حاصل کی اور جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھنے والے ادیبوں میں اپنی پہچان بھی بنائی اسی لیے جہاں ایک طرف ان کے اکثر و بیشتر کردار مریض ہوا کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان میں نمو کی صلاحیت اور صحت یابی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ ان کا آخری آدمی بھی بندر بنتے بنتے یہ اعلان کرنے لگتا ہے کہ وہ انسان ہے اور اس کے لیے انسان ہونا ممکن ہو پاتا ہے۔

عہدے اور اعزاز

ڈاکٹر انور سجاد نے ایک عرصے تک Pakistan national college of arts university of the panjab (lahor-pakistan) میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ وہ اسٹیج ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کرتے رہے۔ 2004 میں انہیں ECO award of excellence in history, litrature and culture کے اعزاز سے نوازا گیا۔ انور سجاد script creative writing department (OED television network) کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

تصانیف

''ہوا کے دوش پر'' پہلا مطبوعہ افسانہ، اپریل 1951ء
''رگِ سنگ'' (ناولٹ)
''استعارے'' (افسانے)
''خوشیوں کا باغ'' (ناول)
''نیلی نوٹ بک'' ترجمہ (ناولٹ)
''صبا اور سمندر'' (ٹیلی ڈراما)
''تلاش وجود'' (مضامین)

☆☆☆